شمائلہ نورین
اسکالر،پی ایچ ڈی اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
ڈاکٹر روبینہ ترین
پروفیسر شعبہ اردو، بہاء الدین زکریایونیورسٹی، ملتان

ڈاکٹر اسلم انصاری بطور میر شناس

Shumaila Noreen
PhD Scholar , Department of Urdu, AIOU, Islamabad.
Dr. Rubina Tareen
Prof. (Rtd), Department. Of Urdu, BZU, Multan.

Dr. Aslam Ansari as Specialist in Meer Studies.

Dr. Aslam Ansari is a renowned poet of Urdu, Persian, English and Seraiki. He is not only a poet but also a prominent researcher and a critic of Urdu literature. His research work on classical Urdu poets gives him notable position among the specialists of Bedil, Meer, Ghalib and Iqbal studies. This article presents a detailed analysis of his research on Meer. He has pen down different essays about the various prospects of Meer's poetry. The collection of these essays is recently published titled as "Jisay Meer kehtay hain Sahibo". This article is about the detailed introduction and analysis of these writings. We attempt to determined Dr. Aslam Ansari's place in the tradition of recognizing Meer.

Key Words: *Meer, Studies, Aslam, Ansari, Urdu, literature.*

"میر شناسی" اس روایت کا نام ہے۔ جس میں ناقدین نے میر تقی میرؔ کی زندگی، کلام اور فن کے حوالے سے بحث کی، تحقیق کی اور نقد و تنقید کے ذریعے میرؔ کی تفہیم کو ادب کے قارئین کے لیے آسان بنایا۔ میر شناسی کی مختلف صورتوں کے سے بات کرتے ہوئے نذر عباس اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالے میں رقم طراز ہیں کہ:

> "میر شناسی کی سب سے پہلی صورت وہ ہے جو میرؔ کی اپنی ذات اور اپنے کلام کے حوالے سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ اگرچہ یہ صورت اپنی ستائش کا انداز لیے ہوئے شاعرانہ تعلی پر مشتمل ہے۔ لیکن آنے والے وقت نے یہ ثابت کر دیا کہ اپنی شاعری کے بارے میں میرؔ کی اپنی رائے بڑی حد تک صحیح تھی۔" (۱)

اس رائے کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ میر شناسی کی ابتدا خود میر تقی میرؔ سے ہی ہوئی۔ "نکات الشعراء" میں اس کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں اور پھر میرؔ کی آپ بیتی "ذکر میرؔ" ان کے سوانحی حالات کی بنیادی دستاویز کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ قدیم دور میں تنقیدی اور تحقیقی روایت کی عدم موجودگی کے باعث شعراء کے تذکروں میں معاصر شعراء کے کلام اور زندگی کے چند نقوش ملتے ہیں۔ لہٰذا تمام کلاسیکی شعراء کے بارے میں ابتدائی معلومات ہمیں ان تذکروں سے ہی ملتی ہیں۔ لیکن بیسویں صدی تک آتے آتے میر شناسی جب باقاعدہ ایک ادبی فہم کا درجہ اختیار کر گئی تو میر شناسوں میں نمایاں نام ڈاکٹر سید عبداللہ کا لیا گیا۔ ان کی کلیدی کتاب "نقد میرؔ" اس سلسلے کی پہلی باضابطہ کڑی کے طور پر سامنے آئی۔ ان کے بعد میرؔ پر لکھنے والوں میں ڈاکٹر جمیل جالبیؔ، نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، خواجہ احمد فاروقی، گوپی چند نارنگ، قاضی افضال حسین، شمس الرحمن فاروقی اور بہت سے ناقدین و محققین شامل ہیں۔ اب اس فہرست میں ہم ڈاکٹر اسلم انصاری کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر اسلم انصاری اردو، فارسی، انگریزی اور سرائیکی کے مایہ ناز شاعر ہیں۔ سرائیکی میں ایک ناول بیڑی اچ دریا" کے نام سے سرائیکی ادب میں اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ اردو میں چند ایک افسانے بھی تحریر کیے۔ وہ اقبال کی اردو شاعری کے منتخب حصوں کا منظوم فارسی ترجمہ بھی کر چکے ہیں۔ بیدلؔ کے چند اشعار کا اردو ترجمہ اور خواجہ غلام فریدؒ کی کافیوں کا انگریزی میں ترجمہ کر کے ایک ماہر مترجم کے طور پر اپنی قابلیت کا لوہا منوا چکے ہیں۔ اردو ادب کی تدریس سے تا عمر وابستہ رہے۔ گھریلو ادبی ماحول کی بدولت انہوں نے کلاسیکی عالمی ادب اور فلسفے کا غائر نگاہی سے مطالعہ کیا علامہ محمد اقبال کی فکر اور شاعری سے حد درجہ متاثر رہے۔ اردو ادب میں ڈاکٹریٹ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے ۱۹۹۸ میں کیا۔ ان کے تحقیقی مقالے کا عنوان "اردو شاعری میں المیہ تصورات" تھا۔ اس کے علاوہ بائیس کتابیں ان کے تخلیقی اور تحقیقی و تنقیدی علمی اور ادبی سرمائے پر مشتمل ہیں۔

ڈاکٹر اسلم انصاری اردو شاعری کی کلاسیکی روایت سے متاثر ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے شاگرد ہونے کا اعزاز بھی انہیں حاصل رہا اور کلاسیکی شعراء کے کلام کے غائر مطالعے کا تقاضا بھی یہ تھا کہ وہ ان شعراء کے مختلف پہلوؤں پر اپنی تحقیقی و تنقیدی آراء کو قلم بند کریں۔ لہٰذا جہاں وہ اقبال فہمی میں اپنا نام بناتے ہیں۔ وہیں انہوں نے بیدلؔ، میرؔ اور غالبؔ جیسے عظیم کلاسیکی شعراء پر بھی قابل قدر تحقیقی اور تنقیدی مضامین قلم بند کر کے اردو ادب کی روایت میں اپنا نام ایک سنجیدہ محقق اور ناقد کے طور پر رقم کروایا۔ وہ اپنے مطالعات میں اس قدر زیرک اور غائر نگاہی کا اظہار کرتے رہے ہیں کہ ان کی تحاریر اپنے آپ میں ایک سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے اقبال کی فکر اور شاعری پر لکھے گئے مضامین اور منظوم اقبالیات کا ایک مجموعہ شامل کر کے اب تک پانچ کتابیں قارئین کی نذر ہو چکی ہیں۔ غالبؔ پر ان کی فکر کا شاخسانہ "غالب کا جہانِ معنی" کے نام سے

ملک کے ادبی حلقوں سے دادو تحسین وصول کر چکا ہے جبکہ بیدلؔ کے حوالے سے مضامین اور بیدل کے منتخب اشعار کے تراجم پر مشتمل مجموعہ ان کے وسیع المطالعہ محقق ہونے پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ اور حال ہی میں ان کی میر تقی میرؔ کے حوالے سے شائع ہوئی کتاب "جسے میر کہتے ہیں صاحبو" اردو ادب میں میر شناسی کی روایت میں ایک اہم اضافے کے طور پر شہرت پا رہی ہے۔

ڈاکٹر اسلم انصاری کے مطابق میرؔ اردو کے پہلے شاعر تھے جنہوں نے اردو غزل کو اپنایا اور تجربے کی صداقت، جذبے کی شدت، گہرائی اور فکر کی وسعت سے روشناس کروایا۔ انہیں میرؔ کے کلام میں وجود عدم، تصوف، محبت کی عالمگیریت، عظمت آدم کا تصور، جنسی لذتوں کی طرف میلان اور دانش برہانی کے مقابلے میں انسانی دانش کے حامل ہونے کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔ وہ میرؔ کے احساس کی موجودہ دور کے ساتھ جڑت کو محسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> "ہمارے عہد کی انسانی صورت حال، انفرادی ہو یا اجتماعی، اتنی پیچیدہ اور مبارز طلب ہے کہ آج کا فنکار، ادیب اور شاعر بھی بہ مشکل اس کو فن کی گرفت میں لانے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ اس صورت حال میں آج سے ڈھائی پونے تین سو سال پہلے کے شاعر سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ اس کے ہاں ہمارے عہد کی مکمل پیش بینی مل جائے۔ لیکن چونکہ میرؔ نے اپنے عہد کی انفرادی اور اجتماعی صورت حال کو تمام و کمال نہ سہی۔ بہت حد تک فن کی زبان میں بیان کیا ہے۔ اس لیے عجب نہیں کہ ان کے ہاں ایسے اشعار بہ کثرت مل جائیں۔ جن کو سن کر یا پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ان میں ہمارے عہد کی بات کی گئی ہے۔"(۲)

ڈاکٹر اسلم انصاری میرؔ کی شاعری کو کلاسیکیت کا معجزہ قرار دیتے ہیں اور اس کی وجہ وہ میرؔ کے المیہ تاثر سے ہٹ کر لسانی وسعت کو سمجھتے ہیں وہ عصر حاضر کے لسانی علوم کی روشنی میں میرؔ کی شاعری کو غیر معمولی لسانی مظہر ٹھہراتے ہیں۔ وہ میرؔ کے ذخیرہ الفاظ کی تحسین بارہا مختلف مضامین میں کرتے ہوئے سوداؔ سے بھی ان کا موازنہ کرتے ہیں۔ لیکن آخر کار اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سوداؔ اپنے قدرت کلام کے باوجود لسانی وسعت کے اعتبار سے میرؔ کے ہم پلہ نہیں قرار دیئے جاسکتے۔ وہ میرؔ کے ہاں لب ولہجہ کی اہمیت پر مضمون تحریر کرتے وقت کہتے ہیں کہ:

> "انداز بیان کے سلسلہ میں میرؔ کم و بیش اسی نظریئے کے حامل ہیں۔ جس کی رو سے شاعری کو عام بول چال کی زبان سے زیادہ سے زیادہ قریب رہنا چاہیے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ میرؔ اپنے ہر انفرادی تجربے کو ایک تہذیبی تجربہ بنا کر پیش کرنا چاہتے تھے۔"(۳)

میرؔ کے بارے میں ڈاکٹر اسلم انصاری ایک خیال یہ بھی پیش کرتے ہیں کہ عام زندگی میں وہ جس قدر کم گو تھے۔ اپنی شاعری میں اتنے ہی پُر گو اور گفتگو کے دلدادہ تھے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں بیانیہ اور گفتگو کرنے کا انداز بہ

طور خاص غالب ہے۔ یہ رنگ مکالمے کی فضا قائم کرتا ہے۔ جس سے تمثیلی عناصر بھی میرؔ کے کلام میں جابجا بکھرے دکھائی دیتے ہیں۔

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا___!

تکتا تھا کسو کا منہ، کہتا تھا کسو سے کچھ
کل میرؔ کھڑا تھا یاں سچ ہے کہ دوانہ تھا

ڈاکٹر اسلم انصاری میرؔ کے کلام کی خصوصیات پر مقدمہ پیش کرتے ہوئے رطب اللسان ہیں ان کے نزدیک گفتگو کرنے اور سننے کے تمام قرینے ان کے پیش نظر رہتے ہیں۔ اردو شاعری کی تاریخ میں وہ واحد شاعر ہیں۔ جنہوں نے اپنی شاعری کی تکنیک میں لب ولہجہ کو اس قدر اہمیت دی ہے۔لب ولہجہ بڑی شاعری کی شرط لازم تو نہیں، اس لیے کہ بعض عظیم شعراء کے ہاں معنویت اتنی حاوی ہے کہ یہ پہلو کچھ دبا دبا نظر آتا ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاعر کی ذاتی آواز اور اس کا آہنگ معانی انہیں شعروں میں ابھرتا ہے جو لب ولہجہ کے تیور لیے ہوتے ہیں۔ڈاکٹر اسلم انصاری میرؔ کی طویل بحر کی غزلوں کے تغزل اور موسیقیت کے ساتھ ساتھ انبساط اور اہتزاز کا پہلو بھی تلاش کرتے ہیں۔ لیکن وہ اسے نشاطیہ انداز کہنے سے گریز کرتے ہیں۔ جبکہ ان کے خیال میں چھوٹی بحر کی غزلوں میں ”گلو گرفتگی“ زیادہ ہے۔

میرؔ کے کلام میں حزنیہ اور المیہ فضا کے حامل مضامین کثرت سے ہیں۔ جس پر تمام ناقدین اور میر شناس متفق ہیں۔ ڈاکٹر اسلم انصاری بھی اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں ہوئے میرؔ کو اردو کا سب سے بڑا الم نگار شاعر قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں اردو شاعری کو بنیادی طور پر المیہ آہنگ عطا کرنے میں میرؔ کا کردار نہایت اہمیت کا حامل ہے اور اسے تاریخی طور پر مسلم بھی ٹھہرایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری اپنے مطالعات میرؔ کے سلسلے کے تمام مضامین میں اس بات کا اظہار بار بار کرتے ہیں۔ لیکن اپنی کتاب ”اردو شاعری میں المیہ تصورات، میں میرؔ کے کلام میں غم ناک عناصر کی وجوہات پر تفصیلاً بات کرتے ہیں۔ اس باب کا عنوان ”میر تقی میرؔ“ اردو کا عظیم ترین الم نگار شاعر، غم عشق، غم حیات اور غم کائنات“ ہے۔

میرؔ کے غم کے بنیادی محرکات میں اسلم انصاری ان کے عہد کے زوال پذیر سیاسی وسماجی حالات، یاد ماضی، یاد رفتگاں، محبت کی نارسائی اور ذاتی جذباتی و معاشی بدحالی جیسے مظاہر کو شامل ہیں لیکن اسلم انصاری ان کے غم کے مثبت اور تعمیری رخ سے بھی صرف نظر نہیں کرتے، لکھتے ہیں کہ:

"میرؔ کی الم پسندی کا سب سے مثبت اور تعمیری رخ یہ ہے کہ ان کا المیہ طرز احساس عصری شعور کے ساتھ گہری وابستگی رکھتا ہے۔ اپنے عہد کی شکست وریخت اور اپنے عہد کے انسان کے الم

ناک انجام نے میرؔ کے احساس اور وجدان کو ہمیشہ شدت کیساتھ متاثر کیا۔ اس لیے ان کی شاعری کا ایک متعدبہ حصہ ایک طرح کے شہر آشوب کی صورت میں ڈھل گیا۔ جس کے مختلف اجزا ان کی اکثر غزلوں میں مل جل گئے گئے۔"(۴)

ایک اور اہم موضوع جس پر ڈاکٹر اسلم انصاری نے اپنے مشاہدات قارئین کی نذر کیے ہیں "میرؔ کی شاعری میں فاصلے کے تصورات" ہیں۔ ان کے خیال میں میرؔ کے الفاظ و تراکیب کے غائر مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں زمانی اور مکانی فاصلوں کا بہت گہرا احساس تھا۔ جس میں مکانی فاصلہ خصوصاً ان کے نہایت شخصی تصورات کا ضروری جزو بن کر ابھرتا ہے۔ یہ مکانی بُعد ان کے المیہ طرز احساس کا بہت بڑا سرچشمہ بھی ہے۔

یک بیاباں بہ رنگ صوت جرس
مجھ پہ ہے بے کسی و تنہائی

اسلم انصاری، میرؔ کے حالات زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے دیتے ہیں کہ ان کی ذات کا دائرہ نامساعد حالات کے باعث ہمیشہ ان پر تنگ رہا۔ لہٰذا ”تنگی جاء“ کا احساس بھی ان پر غالب رہا۔ اس کے مقابلے میں ان کی تخلیقی توانائی ان کے اندر ”عظمت شخصی“ کا احساس پیدا کرتی تھی۔ اس لیے ظرف مکانی کی کمی یا تنگی ان کے لیے گھٹن کا باعث بنتی تھی۔ اس احساس اور اس کشمکش کی کچھ مثالیں ملاحظہ کریں:

اب در باز بیاباں میں قدم رکھیئے میرؔ
کب تلک تنگ رہیں شہر کی دیواروں میں
پاؤں کو دامن محشر میں ناچاری سے ہم کھینچیں گے
لائق اپنی وحشت کے اس عرصے کا میدان نہیں

یہ تنگی جاء کا احساس جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو میرؔ کے ہاں سفر کی خواہش سر اٹھاتی ہے۔ یہاں اسلم انصاری کے خیال میں باہر کے سفر کے برعکس ایک اندر کا سفر بھی انہوں نے بہ خوبی طے کیا۔

ایک اور مضمون بہ عنوان "میرؔ کی دو درسگاہیں، شہر دہلی اور خان آرزو کی حویلی "میرؔ کی شعری اور ذہنی تربیت کی آماجگاہوں کی متعلق معلومات پر مبنی ہیں۔ اسلم انصاری میرؔ کی سوانح سے یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت خاطر خواہ نہیں ہو پائی تھی۔ اس کمی کو ان کے منہ بولے چچا کی صحبت نے پورا کیا۔ ان کے پاس سات سال تک رہنے کے بعد میرؔ نے اکبر آباد سے دہلی کا سفر اختیار کیا اور یہاں ان کا قیام دہلی کے مایہ ناز شخصیت سراج الدین علی خان آرزو کے ہاں رہے اور یہیں سے میرؔ کی شخصیت کی پرورش و پرداخت کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ مضمون کے آخری پیراگراف میں اس ساری بحث کو سمیٹ کر ان الفاظ میں جامع طور پر پیش کر دیا گیا ہے۔

"میر کی شاعری کا مرکزی کردار تو وہ خود ہیں۔ وہ زیادہ تر تجربے اور مشاہدے پر مبنی بات کرتے ہیں لیکن جہاں ان کے موضوعات و مضامین کا تعلق ہے۔۔۔ بہت سی ایسی باتیں جن میں کوچہ و بازار کے لوگوں کی "ابے تبے" بھی شامل ہے۔ مشاہدے کی دنیا ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن میرؔ نے انہیں اپنی زبان بنا کر ہی پیش کیا ہے۔ کیونکہ یہ سب کردار، یہ لہجے، یہ آوازیں، یہ صدائیں، دہلی کے کوچہ و بازار سے ابھری تھیں اور یہ ہی کوچہ و بازار خان آرزو کی حویلی کے بعد ان کی سب سے بڑی درس گاہ تھے۔"(۵)

ان کا ایک مضمون میرؔ کے متقدمین سے استفادہ مضامین کے موضوع پر مشتمل ہے۔ اس مضمون میں اسلم انصاری نے میرؔ کے اپنے پیش رووٗں سے استفادہِ کی مثالیں پیش کی ہیں۔ وہ سراج الدین علی خان آرزوؔ سے متاثر تھے۔ وہ خود فارسی کے شاعر اور انشا پرداز تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے شاگردوں کو اردو شاعری کی راہ کی دکھائی اور ابہام گوئی کے مقابلے میں معنی آفرینی کو اپنانے پر زور دیا۔

اسلم انصاری کے خیال میں ابہام گوئی کی روایت سے انحراف کی وجہ سراج الدین خان آرزوؔ کا بیدلؔ کی شاگردی میں رہنا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ان کی بلند نگاہی نے میرؔ کو ابہام گوئی کے راستے سے ہٹ کر روش اختیار کرنے کا جو راستہ دکھایا۔ اس نے ایک ایسی شاعری کو وجود دیا جس نے پوری اردو شاعری کی روایت کو متاثر کیا۔

ڈاکٹر اسلم انصاری سراج الدین خان آرزو کے علاوہ میرؔ کو متاثر کرنے والے شعراء میں فضلی اورنگ آبادی کا ذکر کرتے ہیں۔ جبکہ فارسی کے شعراء میں شیخ سعدیؒ کا نام لیتے ہیں۔ سبک ہندی کے شعراء میں انہوں نے بیدلؔ اور صائبؔ سے اکتساب فیض کی مثالیں میرؔ کے اور مذکور شعراء کے کلام سے پیش کی ہیں۔

میرؔ کے حوالے سے ان کی ایک اور تحریر اپنے موضوع کے اعتبار سے انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کا عنوان "میرؔ معلم زیست کی حیثیت سے" ہے۔ اسلم انصاری میرؔ کو قدیم شعراء میں سے واحد ایسے شاعر قرار دیتے ہیں۔ جن کی شخصیت میں ایک معلم اخلاق اور معلم زیست کی سی تمکنت اور گہرائی نظر آتی ہے۔ مصنف میرؔ کے ہاں رومانوی اجزاء کی واضح موجودگی کے باوجود ایک معلم اخلاق کا روپ پا لیتے ہیں۔

"گو اس بات کی وضاحت بھی بہر نوع ضروری ہے کہ وہ اصطلاحی معنوں میں معلم اخلاق نہیں۔ لیکن وسیع معنوں میں ایک معلم زیست ضرور ہیں۔ ایک تو ان کی شاعری میں امر و نہی کے صیغوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ شاید ہی کسی اور شاعر کے ہاں (یا کم از کم حالیؔ اور اقبالؔ سے پہلے کسی شاعر کے ہاں) اس کی مثال ملتی ہو۔ میرؔ کو امر کرنے اور روکنے میں وہی لطف ملتا ہے جو کسی معلم زیست کا سرمایہ زندگانی ہو سکتا ہے۔"(۶)

ان کے خیال میں میرؔ کے کلام میں مسلسل اس بات کا اظہار ملتا ہے کہ فرد کو اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرتے رہنا چاہیے اسی سے اس کی فردیت کی تکمیل ممکن ہو سکتی ہے۔

اسلم انصاری "میرؔ کی حس تاریخیت اور ان کی 'خرابہ نگاری' " کے عنوان سے میرؔ کی دہلی سے محبت کے بیان کو رقم کرتے ہیں۔ اس سے قبل بھی وہ مختلف مضامین میں میرؔ کی اپنے وطن سے محبت کا ذکر کر چکے ہیں۔ لیکن اس مضمون میں وہ دہلی کے اجڑنے کے مضمون کو "خرابہ نگاری" کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ میرؔ کے ہاں دہلی کا اجڑنا سب سے بڑا المیہ عنصر بن کر ابھرتا ہے۔ ان کے بہت سے اشعار اس کا اظہار ہیں۔

اسلم انصاری میرؔ کے کلام میں زبان کی کہنگی کو بھی زیر بحث لاتے ہیں اور وہ دہلی کے ذکر اور زبان کے امتزاج سے ابھرنے والے تاثر کو میرؔ کے ہاں تاریخ کی تجسیم خیال کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ دہلی اور لکھنؤ کی تہذیب میں فرق بھی میرؔ کے اشعار میں واضح طور پر بیان ہوتا ہے۔ ہر چند کہ وہ مجبوراً لکھنؤ میں قیام پذیر ہوئے۔ لیکن ان کا جی یہاں کبھی نہ لگ سکا اور دہلی کو ہی یاد کرتے رہے۔

خرابہ دلّی کا دہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں میں کاش مر جاتا سراسیمہ نا آتا یاں
برسوں سے لکھنؤ میں اقامت ہے مجھ کو لیک
یاں کے چلن سے رکھتا ہوں عزم سفر ہنوز

اسلم انصاری کو میرؔ کے ہاں غم کے اظہار کے ساتھ ساتھ خواہش نشاط اور لمحات انبساط کی چاہت بھی دکھائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری میرؔ کے کلام میں سے درپردہ خوشی کی آرزومندی کا سراغ لگاتے ہیں۔ ان کے خیال میں وہ غم کے ترجمان ضرور ہیں۔ لیکن غم کو زندگی کا مقصد نہیں سمجھ لیتے۔ بلکہ تمام تر غم پسندی کے باوجود وہ خوشی کے حصول کی ایک کسک رکھتے ہیں۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ غم کے ساتھ میرؔ کا تعلق مریضانہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک حساس فنکار جیسا ہے جسے مجبوری کے تحت غم اٹھانے پڑے۔ اسلم انصاری اس سلسلے میں میرؔ کے ان اشعار سے مدد لیتے ہیں۔

ہوئی عید سب نے پہنے طرب و خوشی کے جامے
نہ ہوا کہ ہم بھی بدلیں یہ لباس سوگواراں

اسلم انصاری اس "نہ ہوا کہ ہم بھی بدلیں" کے اندر حصول مسرت کی خواہش کو ہمکتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ وہ میرؔ کے کلام میں سے صرف ایک شعر ایسا پیش کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ جس میں میرؔ نے "خوش ہوں" کا جملہ استعمال کیا ہے۔

دل کھلتا ہے واں صحبت رندانہ جہاں ہو
میں خوش ہوں اسی شہر سے مے خانہ جہاں ہو

میرؔ مظاہر فطرت سے بھی جمالیاتی تسکین پاتے ہیں۔ خصوصاً باغ اور بہار کے مناسبات کے حوالے سے وہ حواس و تخیل کو مہمیز ہوتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگ گل سے میرؔ
بلبل پکاری دیکھ کر صاحب پرے پرے

ملا ہے خاک میں کس کس طرح کا عالم یاں
نکل کے شہر سے ٹک سیر کر مزاروں کی

میرؔ کے لسانی تجربات اور تشکیلات کے حوالے سے ڈاکٹر اسلم انصاری نے بارہا تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ لیکن "میرؔ کی عربیت" کے عنوان سے ایک الگ مضمون تحریر کر کے انہوں نے میرؔ کی علمی استعداد پر جامع بحث کی ہے۔ ان کے خیال میں میرؔ کی شاعری میں آنے والے عربی الفاظ وہ ہیں۔ جنہیں کوئی عربی زبان پر دسترس رکھنے والا ہی استعمال کر سکتا ہے اور ایسا خیال ظاہر کرنے کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ میرؔ نے ان الفاظ کو جس طرح لغوی معنی میں استعمال کیا ہے۔ وہ کسی ایسے شاعر یا ادیب کے بس کے بات نہیں جس کا عربی زبان کا علم واجبی ہو۔ ڈاکٹر اسلم انصاری اپنی بات کے ثبوت کے طور پر میرؔ کے کلام سے مثالیں پیش کرتے ہیں۔

شب ہجر میں کم تظلم کیا
کہ ہم سائیگاں پر ترحم کیا
رہی تھی دم کی کشاکش گلے میں کچھ باقی
سو اس کی تیغ نے جھگڑا ہی انفصال کیا

یہ اور اس طرح کے بہت سے اشعار اسلم انصاری مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں اور حاصل کلام سطروں میں کہتے ہیں:

> "اس مضمون میں پوری کلیات کا استقصاء نہیں کیا گیا۔ صرف اس حقیقت کو اجاگر کرنا تھا کہ میرؔ کی شاعری میں عربیت کے عناصر اردو کے دیگر شعرا کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں۔ اس معاملے میں ممکن ہے میر انیسؔ میرؔ سے لگا کھاتے ہوں یا میرؔ پر کچھ برتری رکھتے ہوں۔"(۷)

"میرؔ کے دو شعروں کی نادر تشریح" کے عنوان کے ساتھ ایک اور مضمون میں وہ کہتے ہیں کہ میرؔ کے عہد سے لے کر آج کے زمانے تک کلام میرؔ کی شرح کی ضرورت بہت زیادہ محسوس کی گئی۔ اس ضمن میں وہ سب سے پہلے شارح ناطق لکھنوی کا ذکر کرتے ہیں۔ جنہوں نے میرؔ کے بعض اشعار کی شرح لکھنے کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا۔ ڈاکٹر اسلم انصاری ان کے شرح کردہ دو اشعار پر تفصیلی رائے دی ہے۔ "میرؔ کی فارسی شاعری" پر بحث کرتے ہوئے میرؔ کے فارسی دیوان کے متعلق بتاتے ہیں کہ بہت عرصے تک وہ دیوان دستیاب نہیں تھا۔ لیکن بیسویں صدی کے نصف آخر تک وہ دریافت ہو چکا تھا۔

> "جناب نیر مسعود نے ۱۹۸۱ء میں میرؔ کے فارسی دیوان کے ابتدائیہ میں لکھا کہ اب (۱۹۸۱ء) سے ساٹھ برس پہلے (۱۹۲۱ء) میں ان کے والد محترم پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب نے اودھ کے شاہی کتب خانے میں میرؔ کی غیر مطبوعہ اور نہایت ہی کم یاب تصنیفوں کا مجموعہ بھی دریافت کیا جس میں ان کے فارسی دیوان کا ایک قلمی نسخہ بھی شامل تھا۔۔۔ مصحفیؔ نے میرؔ کے فارسی اشعار کی تعداد دو ہزار بتائی ہے جبکہ نیر مسعود صاحب کا کہنا ہے کہ ان کے فارسی دیوان میں شعروں کی تعداد پونے تین ہزار سے متجاوز ہے۔" (۸)

ڈاکٹر اسلم انصاری میرؔ اور بیدلؔ کے اشعار کا تقابل کر کے یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ میرؔ کی فارسی شاعری میں بیدلؔ کی زمینوں کی تقلید اس قدر ہے کہ انہیں بیدلؔ کا مقلد شاعر قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ لیکن اسلم انصاری میرؔ کی فارسی شاعری کو ان کے اردو کلام کا ترجمہ ہی خیال کرتے ہیں۔ مگر وہ اس بحث کو یہ کہتے ہوئے سمیٹتے ہیں کہ جس شخص نے پانچ سو سے زیادہ غزلوں پر مشتمل فارسی کا دیوان چھوڑا ہوا ہے کم تر درجے کا شاعر قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ڈاکٹر اسلم انصاری نے جس شاعر پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ اس کا تقابل اس کے معاصر شعراء کے ساتھ ضرور کیا ہے۔ یہاں وہ میرؔ کا تقابل سوداؔ کے ساتھ کرنے سے نہیں چوکتے۔ "میرؔ و سوداؔ" کے عنوان سے مضمون تحریر کرتے ہوئے وہ قارئین کے لیے ایک صحت مند فنی مسابقت کی فضا قائم کرتے ہیں۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ میرؔ کے عہد کو اردو ادب کے اکثر مستند مؤرخین نے "میرؔ و سوداؔ" کا عہد قرار دیا ہے اور اس کی وجہ سوداؔ کا اپنے عہد کا سب سے بڑا قادر الکلام شاعر ہونا ہے۔ ان کی اس حیثیت کا اعتراف خود میرؔ نے بھی "تذکرہ نکات الشعراء" میں کیا ہے۔

> " میرؔ کی طرح سوداؔ کی استادی بھی ان کے قیام دہلی کے زمانے میں مسلّم ہو گئی تھی۔ ان کی عظمت فن کو غزل سے زیادہ قصیدہ اور ہجو گوئی میں تسلیم کیا گیا۔ غزلیں بھی انہوں نے معرکے کی کہیں جو ان کی قدرت کلام اور زبان دانی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ لیکن میرؔ کی غزل کا نقش لوگوں کے دلوں پر ایسا گہرا ہے کہ ان کی غزل کو میرؔ کے مقابلے میں زیادہ پذیرائی نہ ملی۔" (۹)

ڈاکٹر اسلم انصاری سوداؔ کو اعلیٰ درجے کا نظم نگار مانتے ہیں۔ وہ ان کی غزل کو اظہار ذات سے زیادہ آرٹ سمجھتے ہیں جس میں شخصی عنصر موجود ہو لیکن اس کی نوعیت زیادہ تر غیر شخصی آرٹ کی ہو جبکہ ان کے نزدیک میرؔ کے ہاں یہ چیز صناعی کا روپ دھار لیتی ہے وہ اس تقابل کا حاصل یہ پیش کرتے ہیں کہ:

"اس میں کچھ شبہ نہیں کہ میرؔ اور سوداؔ نے اپنے اپنے رنگ میں اردو زبان اور اردو شاعری کو ان بلندیوں سے آشنا کیا جہاں وہ عمیق انسانی احساسات اور افکار عالیہ کو بیان کرنے کے قابل ہو سکی! اتنا فرق البتہ ضرور پیدا ہو گیا کہ میرؔ کے مقابلے میں سوداؔ کی شاعری کا بہت سا حصہ متروکات ادب میں شامل ہو گیا ہے جبکہ میرؔ کی شاعری میں نئی معنویتوں کی تلاش جاری ہے۔"[۱۰]

ڈاکٹر اسلم انصاری نے معاصر ناقدین پر بہت کم تنقید کی ہے۔ لیکن جہاں انہیں محسوس ہوا کہ اردو ادب کے بڑے بڑے نام کسی فاش غلطی یا غلط فہمی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ وہ ایک سخت ناقد کے طور پر ان کے اس کام پر گرفت کرتے ہیں۔ جس کی مثال ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی غالبؔ کے فارسی اشعار کے غلط ترجمے والے معاملے میں واضح طور پر نظر آئی[۱۱] اسی طرح وہ ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی کی کتاب "شعر شور انگیز" جو ایک معروف کتاب ہے۔ اس کی پہلی جلد کے مطالعات پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے "شعر شور انگیز" چند استدراکات (جلد اوّل کے تناظر میں) " کے نام سے تفصیلی مضمون قلم بند کیا۔ اس میں وہ "شعر شور انگیز" میں شمس الرحمن فاروقی جیسے بڑے ناقد کی بہت سی آراء اور تشریحات سے اختلافات کرتے ہیں۔ مثلاً اقبالؔ کے اشعار کو کسی اور حوالے میں نقل کرنا، میرؔ کے اشعار میں ترکیبات لفظی کی غلط تشریح، خواجہ آتش کے شعر میں "پرداز" کے مفہوم میں غلطی اور بیدلؔ کے اشعار کی غلط تفہیم۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کا فارسی شعر و ادب کا مطالعہ نہایت وسیع ہونے کے باعث وہ فارسی زبان و ادب اور اردو میں فارسی الفاظ کے معانی و مفاہیم سے بہ خوبی آگاہ ہیں۔ اس لیے ان کی رائے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ "شعر شور انگیز" میرؔ کے کلام کو کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ خود میرؔ اپنے کلام کو "شور انگیز" قرار دیتے ہیں۔

جہاں سے دیکھئے ایک شعر شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیواں میں
ہر ورق، ہر صفحے پر ایک شعر شور انگیز ہے
عرصہ محشر ہے عرصہ میرے بھی دیوان کا

شمس الرحمن فاروقی کی کتاب کے عنوان کے بارے میں اسلم انصاری کہتے ہیں کہ:

"مصنف نے اس کتاب میں جس بنیادی مفروضے کو مسلمہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ وہ صرف اتنا ہے کہ میرؔ کی شاعری شور انگیز ہے۔ اسی شور انگیزی سے کتاب کا عنوان بھی قائم کیا گیا ہے۔۔۔ شور انگیز اور شور انگیزی کا لفظ اتنی بار کتاب میں آیا ہے کہ لگتا ہے اصل "شور انگیزی "یہی ہے۔"شور انگیز" کتاب کی کلیدی اصطلاح ہے اور پہلی بار میرؔ سے وابستہ کی گئی ہے۔"(۱۲)

اس کے بعد ڈاکٹر اسلم انصاری "شور انگیزی" کی اصطلاح پر مفصل تبصرہ کرتے ہیں کہ طویل بحث کے بعد فاروقی صاحب میرؔ اور غالبؔ کا موازنہ کر کے میر کو ہی "خدائے سخن" ٹھہراتے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم انصاری ایک ثابت شدہ بات پر مفروضہ قائم کرنے اور اور پھر اس مفروضے کے اسی نتیجے پر پہنچنے پر کڑی گرفت کی ہے۔ بہر حال ڈاکٹر اسلم انصاری کتاب کے بہت سے مندرجات سے متفق نہیں ہو پائے اور اس پر شدید اعتراض کرتے ہوئے ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی کی کج فہمیوں کا انکشاف کرتے ہیں۔

ڈاکٹر اسلم انصاری اپنی محققانہ حیثیت میں اس قدر مسلم ہیں۔ کہ ان کی تحقیقات قارئین کو شعر اور شاعر فہمی کا کلی ادراک بہم پہنچاتی ہیں۔ وہ ادب، فلسفے، مختلف زبانوں کے عالم اور وسیع مطالعے کے حامل نقاد ہیں۔ کلاسیکی شعراء کے مطالعے کو وہ ادب کے طالب علموں کے لیے سادہ مگر علمی انداز میں خوبصورتی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے رنگ سخن میں میرؔ سے متاثر دکھائی دیتے ہیں اور اس کا اظہار ان کی غزلوں کے مضامین سے بھی ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ وہ کلاسیکی ادب کی روایت کے بہترین نباض ہیں اور میرؔ شناسی کے روایت میں اپنے مطالعات کی بدولت خصوصی امتیاز رکھتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ نذر عباس، "میرؔ شناسی، عصر حاضر میں" مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، شعبہ اردو اورئینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۳۲۰

۲۔ اسلم انصاری، ڈاکٹر "میرؔ کی شاعرانہ عظمت پر ایک نظر" مشمولہ " جسے میر کہتے ہیں صاحبو (مطالعات میرؔ)"، دار لکتاب لاہور، ۲۰۱۹ء ص ۴۱

۳۔ ایضاً، "میرؔ کے فن شاعری میں لب ولہجے کی اہمیت"، ص ۱۰۶

۴۔ ایضاً، "میر تقی میرؔ: اردو کا عظیم ترین الم نگار شاعر" مشمولہ " اردو شاعری میں المیہ تصورات"، مغربی پاکستان اکیڈمی، لاہور ۲۰۰۸ء، ص ۲۴

۵۔ ایضاً،"میرؔ کی دو درسگاہیں، شہر دہلی اور خان آرزو کی حویلی"مشمولہ " جسے میر کہتے ہیں صاحبو"، ص ۱۲۰

۶۔ ایضاً، ”میرؔ کی عربیت“، ص۲۱۱

۷۔ ایضاً، ص۲۱۷

۸۔ ایضاً، ”میرؔ کے دو شعروں کی نادر تشریح“ص ۲۳۴

۹۔ ایضاً،”میرؔ و سوداؔ“ ص ۲۴۴

۱۰۔ ایضاً،”میرؔ کی فارسی شاعری“، ص۲۴۷

۱۱۔ ایضاً، " تفہیم بیدل و غالب میں تسامحات " مشمولہ " غالب کا جہان معنی "بیکن بکس ملتان، ۲۰۱۵ء، ص۲۱۷

۱۲۔ ایضاً، "شعر شور انگیز، چند استدراکات (جلد اول کے تناظر میں)"مشمولہ " پیلوں (سہ ماہی) ملتان "مارچ ۲۰۱۹ء
ص۹۔